# 8- خطاب بہ جوانانِ اسلام

علامہ محمد اقبال (۱۸۷۷ء۔ ۱۹۳۸ء)

**تعارف:** شاعرِ اسلام، حکیم الامت ڈاکٹر علامہ محمد اقبال ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ کے ایک مذہبی گھرانے شیخ نور محمد کے گھر پیدا ہوئے۔ اُس عہد میں اس دیدہ ور کی پیدائش ہوئی، جس میں جہالت کی تاریکی زوروں پر تھی اور مسلمانوں کی حالت ایک سوالیہ نشان تھی۔ ہر طرف جمود طاری تھا۔ اس عظیم مفکر نے قوم کو دعوتِ فکر و عمل کی طرف راغب کیا۔ یہ اقبال کی شاعری کا عطیہ ہی تھا کہ برصغیر کے مسلمان نے دو سو سال پرانی زنجیریں جو مسلمانوں کی غلامی پر دلالت کرتی تھیں وہ زیورِ غلامی مسلمانوں نے اتار پھینکا۔
اس شاعرِ بے مثال نے اپنی شاعرانہ قوت کو محبوب کے لب و رخسار پر ضائع نہیں کیا بلکہ حقیقت کا ترجمان بنتے ہوئے قوم کو فلاح کا راستہ دکھایا۔

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

اقبال نے پرانی روایات اور کہنہ اقدار کے خلاف جنگ بھی کی اور روشن مستقبل کے خواب بھی دیکھے۔ مشہور نظموں میں سے مردِ مومن، خودی، بے خودی، شاہین، عقل و عشق زیادہ اہم ہیں۔ ''اسرارِ خودی''، ''رموزِ بے خودی''، ''پیامِ مشرق''، ''بانگِ درا''، ''زبورِ عجم''، ''جاوید نامہ''، ''بالِ جبریل''، ''ضربِ کلیم''، ''ارمغانِ حجاز''، ''علم الاقتصاد''، اور ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' جبکہ مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق مع مسافر'' مشہور تصانیف ہیں۔ آپ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء میں خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

**خلاصہ:** (سرگودھا 2010، ڈیرہ غازی خان 2009، لاہور 2008,13، گوجرانوالہ 2007)

علامہ اقبالؒ نوجوان مسلم سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے نوجوان مسلم! کیا کبھی تو نے تفکر کیا کہ تیرا تعلق کس عظیم قوم سے ہے۔ وہ عظیم قوم جس نے سلطنتِ ایران کو پاش پاش کر دیا تھا۔ انھوں نے عالمِ دنیا کو مہذب بنایا اور حکومت کرنے کے آداب سکھائے۔ وہ امارت میں بھی فقر و غنا کی دولت سے مالا مال تھے۔ غربت کی حالت میں بھی غیور تھے۔ اور انھیں کوئی امیر صدقہ و خیرات دینے سے ڈرتا تھا۔ اے نوجوان! تجھے اپنے آباؤ اجداد سے کوئی نسبت نہیں کیوں کہ وہ سراپا عمل تھے۔ جب کہ تم صرف باتیں بنانا جانتے ہو۔ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کے ورثے کو بھی گنوا دیا۔ حکومت کا آنا جانا دنیا کا دستور ہے۔ وہ علمی خزانہ جو آج یورپ والوں کے پاس ہے، جن کے متعلق سوچ کر دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ یہ سب کچھ مسلمانوں کی غفلت اور کوتاہی کا نتیجہ ہے۔

**پس منظر:**

(پس منظر زیرِ تشریح نظم کے ہر شعر کی شرح میں لکھا جا سکتا ہے)

علامہ محمد اقبالؒ بیسویں صدی کے عالمِ اسلام کے سب سے بڑے انقلابی شاعر تھے۔ جنھوں نے مسلمانوں کی سوچ و جذب، عمل و محرکات میں انقلاب برپا کر دیا تھا۔ بیسویں صدی کے ابتدائی عشرہ میں جب یہ نظم لکھی گئی تو عالمی منظرنامے پر مسلمان زوال کا شکار ہو چکے تھے۔ برصغیر پر تاج برطانیہ تاباں تھا۔ عراق و ایران پر استعماری قوتیں پنجے گاڑے ہوئے تھیں۔ گو کہ نپولین کی موت کو سو برس گزر چکے تھے لیکن مصر پر ابھی تک فرانس کے آمروں کے علم لہرا رہے تھے۔ مسلمانوں کے یورپی اثاثے (ہسپانیہ، صقلیہ، پرتگال، قبرص) کو چھنے ہوئے سینکڑوں برس گزر چکے تھے۔ طرابلس پر اٹلی ہاتھ صاف کر چکا تھا اور سب سے بڑا المیہ یہ کہ سلطنتِ عثمانیہ (ترکی) یورپ کا ''مردِ بیمار'' بن چکا تھا اور اپنے وجود کی بقا کے لیے برطانیہ کے سامنے کشکول لیے کھڑا ہوا تھا۔ یہ مکمل طور پر مایوس کن حالات تھے اور اقبال نے شعور کی آنکھ وا کی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ جو اوجِ ثریا کے مکیں تھے آج قعرِ زوال میں لڑھک رہے ہیں۔ بہر صورت اپنی قوم کی ڈگمگاتی کشتی کو سنبھالنے کے لیے انھوں نے قلم کا سہارا لیا۔

# اشعار کی تشریح

**(1)** کبھی اے نوجواں مسلم، تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
(ڈیرہ غازی خان 09)

**حل لغت** تدبر کرنا: غور و فکر کرنا، سوچنا گردوں: آسماں یہاں مسلمان قوم مراد ہے

ٹوٹا ہوا تارا: ایسا ستارہ جو ڈیڈ سٹار / بلیک نو مردہ ستارہ بن کر اپنی تاب ناکی کھو بیٹھتا ہے اور آسماں سے جدا ہو کر یا خلا میں یا مختلف سیاروں (زمین وغیرہ) پر گر جاتا ہے۔ (یہاں آبائی راستوں سے منحرف مسلم نوجوان مراد ہے)

**مفہوم:** اے مسلم نوجواں! کبھی غور و خوض بھی کیا تو نے کہ کس عظیم قوم سے ترا تعلق ہے؟

**تشریح:**

جن شعرا نے اپنی شاعری کے ذریعے قوموں کی زندگی میں تبدیلی لائے ہیں اُن میں ایک بڑا نام اُردو اور فارسی شاعری میں علامہ اقبالؒ کا بھی ہے۔ دنیا انھیں ثانی غالب کے نام / لقب سے جانتی ہے۔ انھیں نباض ملت اور حکیم الامت کے القاب سے پکارتی ہے۔

زیر تشریح شعر میں علامہ محمد اقبالؒ مسلم نوجوان سے مخاطب ہیں اور اُسے غور و فکر کی دعوت دے رہے ہیں کہ اے تہذیب مغرب سے مرعوب نوجوان تو نے غور و خوض بھی کیا کہ تو کس آسماں کا شہاب ثاقب (ٹوٹا ہوا تارا) ہے۔ کبھی بحر تدبر میں غوطہ زنی کر کے اپنی اصلیت سے پردے چاک کرنے کی کوشش کی۔ کبھی اپنے گریباں میں جھانک کر دیکھا کہ کس آسماں سے جدا ہو کر تو اپنی تاب ناکی کھو بیٹھا ہے۔ دراصل گردوں سے مراد ماضی کے عظیم مسلمان ہیں جو دنیا پر چھا گئے تھے اور جنھوں نے ساری دنیا کو تہذیب و تمدن اور علوم سے منور کیا تھا اور ''ٹوٹا ہوا تارا'' سے مراد عصرِ حاضر کا گمراہ مسلمان نوجوان ہے۔ اقبال نے نوجوان کو تفکر کی دعوت دی ہے کہ تو ذرا حقیقت کی نظر سے دیکھ کہ کس عظیم ترین قوم سے ترا سلسلہ نسب ملتا ہے۔ ذرا اپنی اصلیت سے آشنائی تو حاصل کر کہ:

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل! کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے

دراصل اقبال مسلم نوجوان کو استفہامیہ انداز میں یہ باور کرا رہے ہیں کہ ترا تعلق اُس قوم سے ہے جس کی عظمت و رفعت، جاہ و جلال آسمان کی طرح بلند تھا۔ لیکن حیف صد حیف آج اے نوجوان مسلم تو نے مغرب کی اندھی تقلید شروع کر دی ہے۔ اپنے آبا و اجداد سے تمام نسبتیں منقطع کر بیٹھا ہے اور اپنا اصل ''مسلم پن'' بھی کھو بیٹھا ہے۔ جواب شکوہ میں علامہ محمد اقبالؒ نے مسلمانوں کی اسی کمزوری کو یوں بیان کیا ہے۔

ہر کوئی مستِ مئے ذوقِ تن آسانی ہے
تم مسلماں ہو! یہ اندازِ مسلمانی ہے!
حیدری فقر ہے، نے دولت عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے!

دراصل عصرِ حاضر کے مسلمانوں نے دورِ ماضی کے مسلمانوں سے منسلک اپنی تمام تر روحانی کڑیاں پاش پاش کر دی ہیں۔ کبھی وہ دور تھا کہ مسلمان کی نگاہ سے کائنات کے در و دیوار لرزتے تھے۔ لیکن آج عالم کفر مسلمانوں کی فنا کے درپے ہے۔ یہ تمام کیسے ہو گیا، یہ اتنا بڑا انقلاب کیوں کر بپا ہو گیا، یہ اقبال ہی سے پوچھ لیجیے کہتے ہیں کہ:

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

اقبال اپنے اشعار میں مسلمانوں کے زوال کی واحد و اصل وجہ فقط شعائرِ اسلام سے روگردانی اور قرآنی تعلیمات پر عمل پیرا نہ ہونا قرار دیتے ہیں۔ بہر صورت اقبال نے تشریح طلب شعر میں نوجوان مسلم کو اس کی اہمیت سے روشناس کرایا ہے اور

اے اپنے من میں جھانک کر حقیقت کو تلاش کرنے کی تلقین کی ہے کہ:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی　　تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن

(2) تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں　　کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا

(ملتان 2008)

**حل لغت:** آغوش: گود　　کچل ڈالنا: تباہ کر ڈالنا

تاج: ایک مرصع کلاہ، جو بادشاہ اپنے سر پر پہنتا ہے　دارا: ''دارا شکوہ'' ایران کا بہادر بادشاہ تھا

**مفہوم:** تجھے اس قوم نے اپنی آغوشِ محبت میں پالا ہے۔ جس نے سلطنتِ ایران کو تسخیر کیا تھا۔

**تشریح:**

پہلے شعر میں اقبالؒ نے مسلم نوجوان کو اپنی اصلیت سے آگاہ ہونے کی نصیحت کی ہے جب کہ زیرِ تشریح شعر میں خود اس کے اسلاف کی حقیقت بیان کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اے نوجوان مسلم تجھے اس قوم نے اپنی محبت بھری گود میں پالا ہے کہ جس نے دارا جیسے بادشاہ (ایرانی استبداد) کا تاج اپنے پاؤں تلے روند ڈالا تھا۔

''دارا'' کا لفظ یہاں بطور تلمیح آیا ہے۔ یاد رہے کہ ایران کی سلطنت میں دارا نامی تین بادشاہ گزرے ہیں۔ دارا شکوہ کا زمانہ 521 قبل مسیح کا ہے اور سکندرِ اعظم نے جس دارا کو شکست دی تھی۔ وہ ''دارا سوم'' تھا جس نے 328 قبل مسیح میں سکندرِ اعظم سے شکست کھائی تھی۔ زیرِ تشریح شعر میں علامہ اقبال نے دارا کا نام علامتی طور پر ایران کی سلطنت کے لیے استعمال کیا ہے۔ اسلام کے آغاز کے زمانہ میں مشرق میں کسریٰ ایران اور مغرب میں قیصرِ روم کی سلطنتیں تھیں۔ جن کا ساری دنیا میں رعب و دبدبہ تھا۔ جس کا قلع قمع عہدِ عمر فاروقؓ میں مسلمانوں نے کیا تھا۔ بقول اقبال:

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے　　وہ کیا تھا؟ زورِ حیدرؓ، فقرِ بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ

ایران جو اس دور میں سب سے بڑی طاقت (سپر پاور) خیال کیا جاتا تھا کو مسلمانوں نے مکمل طور پر 23ھ یعنی 644ء کو تسخیر کیا۔ پہلی مرتبہ ایران پر مثنیٰؓ بن حارثہ شیبانی کی قیادت میں پانچ سو مسلمانوں نے حملہ کیا پھر یکے بعد دیگرے ایران کے دیگر سپہ سالاروں ہرمز، فیروزان، زر بخت وغیرہ کو شکست دی گئی۔ ''جنگِ بویب'' نے ہی ایرانی استبداد کی جڑیں کھوکھلی کر دیں تھیں لیکن دار الحکومت ''مدائن'' کی تسخیر معرکہ قادسیہ کے بعد ہوئی، جو حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کی سربراہی میں لڑی گئی تھی۔ اس جنگ میں ایرانی چھ سو ہاتھیوں اور ڈیڑھ لاکھ فوج (بعض مورخ ایک لاکھ بیس ہزار بھی لکھتے ہیں) فوج کے ساتھ نمودار ہوئے۔ بر عکس اس کے مسلمانوں کے پاس ایک ہاتھی بھی نہ تھا۔

ایرانی افواج کے سپہ سالار رستم نے دہری زرہ پہن رکھی تھی اور جنگ کے تیسرے روز رستم میدان جنگ چھوڑ کر بھاگا اور ایک نہر میں چھلانگ لگا دی۔ چناں چہ بلال بن علقمہؓ نے پہچان لیا اور ایک ہی وار سے اُس کا دوہری زرہ میں روپوش سر اتار ڈالا۔ یہ خبر سن کر ایرانی شہنشاہ ''یزدگرد'' افغانستان کی طرف بھاگ نکلا مکمل طور ایران تسخیر ہو گیا اور ایرانیوں کا تکبر و غرور خاک میں مل گیا۔ مسلمانوں میں موجود اس بہترین جنگی صفت کو علامہ محمد اقبالؒ ایک اور جگہ یوں بیان کرتے ہیں:

شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہاں داروں کی　　کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

الغرض اقبال نے مسلم نوجوان کو اس کے اسلاف کی طاقت کا احاطہ کر کے اُسے اس کی نسبت اور عظمت باور کرائی ہے اور کہتے ہیں کہ آج ایسے لوگ عالمِ اسلام سے ناپید ہو چکے ہیں اور اب یہ قصہ پارینہ بن چکا ہے۔

اقبال نے نوجوانِ مسلم کو یہ احساس دلایا ہے کہ اسے ایسی عظیم قوم نے اپنی آغوشِ محبت میں پرورش کی ہے کہ جس نے ایران کے مشہور بادشاہ دارا کا تاج اپنے پاؤں تلے روند ڈالا تھا۔ وہ اتنی عظیم فاتح قوم کا فرد ہو کر بھی آج پستیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں پڑا ہے۔ اسے چاہیے کہ اپنی کوتاہیوں کو پسِ پشت ڈال کر اپنی کھوئی ہوئی شان و شوکت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے بھرپور کوشش کرے۔ یہی ایک راستہ ہے جو اسے گمنامی کے گڑھے سے نکال سکتا ہے۔

## (3) وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارا — تمدن آفریں، خلاق آئینِ جہاں داری

(ملتان بورڈ 2008)

**حلِ لغت:**

تمدن: رہن سہن کے طور طریقے — آفریں: بنانے والے / تخلیق کرنے والے

خلاق: بنانے والے — آئین: قانون، دستور، قاعدہ — جہاں داری: حکمرانی

شتربان: اونٹ چرانے والے — گہوارا: مسکن، جھولا

**مفہوم:** دشتِ عرب جو کہ اونٹ چرانے والوں کا مسکن ہے کے مکینوں نے رہن سہن کے طور طریقے وضع کیے اور دنیا کو حکمرانی کے قوانین و دستور سے آگاہ کیا۔

**تشریح:**

علامہ محمد اقبالؒ زیرِ تشریح شعر میں نوجوان مسلم کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ تو جس قوم کا فرد ہے وہ عرب کے صحرا سے تعلق رکھتی ہے۔ عرب کو دو اطراف سے سمندر چھو کر گزرتا ہے، پھر بھی مجغرافیائی طور پر یہ قطعہ صحرائی ہے۔ اس سے ملحقہ ممالک یمن و عمان وغیرہ کافی زرخیز ہیں۔ صحرا کے جغرافیائی حالات اونٹوں کی طبیعت کے لیے مرغوب ہوتے ہیں۔ صحرا میں صرف خاردار جھاڑیاں اُگتی ہیں جو کہ اونٹ کی من پسند غذا ہے۔ صحرا کا ریتلا علاقہ اونٹ کے چلنے کے لیے عین موزوں ہوتا ہے۔ شاید اسی لیے مغربی دنیا اسے ریگستان کا جہاز قرار دیتی ہے۔ مزید برآں اونٹ کئی کئی دن بغیر پانی کے بھی گزارا کر سکتا ہے۔ لہٰذا عربی لوگوں کے لیے سب سے موزوں پالتو جانور اونٹ ہی ہو سکتا تھا، اسی لیے عرب کے لوگ اونٹ ہی پالتے تھے۔ تمام دنیا میں سب سے زیادہ اونٹ عرب ہی میں تھے۔

بعثتِ نبوی ﷺ سے قبل عرب ایک تہذیب و تمدن سے ناآشنا معاشرہ تھا۔ بات بات پر لڑنا، قتل و غارت، شراب نوشی اور جوا وغیرہ غرض یہ کہ ہر برائی موجود تھی۔ لیکن جب خدا کا بحرِ رحمت جوش میں آیا تو ان میں امام الانبیا حضرت محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ آپ ﷺ نے عرب کے جاہلوں کی کایا پلٹ دی۔ آپ ﷺ نے ان صحرا نشینوں کی ایسی تعلیم و تربیت کی کہ دنیا کو ورطہء حیرت میں ڈال دیا۔ اور انھیں زندگی گزارنے کے بہترین اصول عطا فرمائے اور تمام قوانین و ضابطے قرآن و سنت کی صورت میں تا قیامت انسانوں کو عطا فرما دیئے۔ بقول شاعر:

> جس نے تہذیب و تمدن کو مؤدب کر دیا
> وحشیوں، صحرا نشینوں کو مہذب کر دیا

بس پھر کیا تھا۔ چشمِ عالم نے دیکھا کہ صرف چند برس کی قلیل مگر معجزاتی تربیت کے نتیجے میں کائنات کی یہ خون ریز و بدترین بستی کائنات کی سب سے عظیم اور متحد قوم بن گئی۔ وہی اوس اور خزرج جن کی ایک دوسرے کے خون سے پیاس نہ بجھتی تھی، ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن گئے۔ وہی لوگ جو عورتوں کو برہنہ طواف کراتے تھے اب عورتوں کی طرف دیکھنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ اس طرح عرب کی یہ قوم دنیا کی سب سے متمدن قوم بن گئی تھی۔

پہلے مصرعے میں دوسری بات اقبالؒ نے دنیا کو حکمرانی کے قوانین سکھانے کے بارے میں کی ہے۔ حضور ﷺ کی سربراہی میں قائم شدہ ریاستِ مدینہ کسی بھی حاکم کے لیے بہترین نمونہ ہے۔ اقلیت کے ساتھ برتاؤ کا معاملہ ہو تو میثاق مدینہ ایک مثالی نمونہ ہے۔ عدل و انصاف کی بات ہو تو دنیا کے سب سے بڑے عادل کا عدل دیکھیے جو سفارش رد کرتے ہوئے بنی مخزوم کی فاطمہ نامی کے لیے سزا تجویز کر رہے ہیں۔

آپ ﷺ کے ہی تربیت یافتہ حضرت عمرؓ کا دور دیکھیے۔ حضرت عمرؓ واقعی ''خلاقِ آئین جہاں داری'' کا بہترین نمونہ تھے۔ چودہ سو برس قبل نافذ کی ہوئی ان کی حکومتی اصلاحات آج بھی دنیا میں نافذ ہیں۔ سلطنت کو انھوں نے پراگنہ (صوبوں) میں منقسم کیا۔ اور آج بھی دنیا کے ہر ملک میں یہ تقسیم کی جاتی ہے۔ بیت المال کا نظام بھی موجود ہے۔ حضرت عمرؓ اس کے موجد تھے۔

بقول شاعر:

تہذیب کی شمعیں روشن کیں اونٹوں کے چرانے والوں نے کانٹوں کو گلوں کی قسمت دی، ذروں کے مقدر چمکائے

اس طرح کی ان گنت اصلاحات ان صحرانشینوں نے نافذ کیں۔ محکمہ البرید (ڈاک کا نظام) بھی عربوں کا ایجاد کردہ ہے۔ اور پھر ان حکومتی اصلاحات کا خود اغیار نے اعتراف کیا۔ 711ء میں جب ان صحرانشینوں نے اندلس فتح کیا تو ان صحرانشینوں کی اصلاحات سے عیسائی رعایا اس قدر خوش ہوئی کہ بعض شہروں کے دروازے انہوں نے خود کھول دیے۔ پی۔ کے۔ ہٹی (P.K.Hutti) اپنے مضمون دی جیولز آف دی ورلڈ میں رقمطراز ہے۔

''آغازِ انسانیت سے ''انڈولوزیا'' اندلس کبھی بھی اتنا ترقی یافتہ نہ تھا جتنا کہ مسلمانوں کے دور میں''۔

بقول شاعر:

غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا

**(4) سماں الفقر فخری کا رہا، شانِ امارت میں بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را**

**حل لغت:**

| | |
|---|---|
| سماں: منظر | الفقر فخری: مجھے فقر پر فخر ہے (حضور ﷺ کی حدیث) |
| امارت: حکومت، دولت مندی | آب: پانی |
| رنگ: سرخی، غازہ | خال: تل |
| خط: نقوش، چہرہ | چہ حاجت: ضرورت نہیں ہوتی / کیا ضرورت ہے |
| روئے زیبارا: خوبصورت چہرے کو | |

**مفہوم:**

ان صحرانشینوں نے اپنی حاکمیت اور عروج کے دور میں بھی فقر اپنائے رکھا۔ کیوں کہ خوب رو چہرے کو ظاہری آرائش کی ضرورت نہیں ہوتی۔

**تشریح:**

علامہ محمد اقبالؒ نے زیرِ تشریح شعر میں قرونِ اولیٰ کے صحرانشین مسلمانوں کی ایک اور صفت بیان کی ہے۔ اقبالؒ کہتے ہیں کہ تمھارے آباؤ اجداد ایک ایسی قوم تھے کہ جس نے دنیا کو مسخر کرنے کے باوجود غربت اور فقر و فاقہ کو اپنا طرہ امتیاز بنائے رکھا۔ کائنات کے سردار حضور ﷺ کی ہی زندگی لے لیجیے۔ دو جہانوں کے سردار ہیں مگر فرماتے ہیں:

**الفقر فخری و الفقر منی۔ (الحدیث)** مجھے فقر پر فخر ہے اور فقر مجھ سے ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں بعض اوقات گھر میں تین تین روز تک چولھا نہ جلتا تھا۔ خندق کی کھدائی کے دوران صحابی نے آ کر پیٹ پر بندھا ہوا پتھر دکھایا تو آپ ﷺ نے قمیص مبارک اٹھائی تو صحابیؓ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ پیٹ مقدس پر دو پتھر

بندھے ہوئے ہیں۔ سادگی کا یہ عالم تھا، سخت چٹائی پر اور اینٹوں یا کھجور کے تکیے پر سو جاتے، حتیٰ کہ جسدِ انور پر نشانات پڑ جاتے تھے۔ اور فقر کا یہ عالم تھا کہ کئی روزے مسلسل رکھتے (یعنی بغیر افطاری وسحری کے)

خلفائے راشدین ہی کو دیکھ لیجیے۔ حضرت ابوبکر صدیق خلیفۂ وقت ہیں لیکن خلافت سے پہلے جس عورت کی بکریوں کا دودھ دوہتے تھے۔ خلافت کے بعد بھی یہی معمول جاری رہا۔ حضرت عمرؓ عظیم ترین منتظم تھے۔ لیکن روم کے سفیر نے دیکھا کہ وہ شخص جس کے خوف سے قیصر کے استبداد کے محلات پر لرزہ طاری ہے مٹی پر آرام کر رہا ہے۔ یروشلم کے صلح نامے کی تحریر کے وقت صحابہؓ نے آپؓ کو قیمتی لباس زیب تن کرنے کو کہا تو آپؓ نے فرمایا:

"خدا نے ہمیں اسلام کی عزت دی ہے جو کہ اصل عزت ہے"۔

چناں چہ یروشلم کے گورنر نے دیکھا کہ 1036 شہروں کا فاتح، عالمِ اسلام کا خلیفہ روئے زمین کی سب سے عظیم خوش حال قوم کا سربراہ (حضرت عمرؓ) جس کے لباس میں چودہ پیوند جڑے ہیں، غلام اسلم کے اونٹ کی نکیل تھامے پیدل چل رہے ہیں تو چلا اُٹھا:

"خدا کی قسم ہم اس قدر سخت کوش قوم کا مقابلہ نہیں کر سکتے جس کے حاکم خود کو غلام سے ادنیٰ سمجھتے ہیں"۔

بقول شاعر

فقیر اور غنی کی بھی تھی ایک حالت ۔۔۔ امیر اور لشکر کی تھی ایک صورت
نہ تھا جس میں چھوٹا بڑا کوئی پودا ۔۔۔ لگایا تھا مالی نے اک باغ ایسا

حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی زندگی بھی فقر سے عبارت ہے۔ الغرض فقر ان لوگوں کا طرہ امتیاز تھا۔

دوسرا مصرعہ جو در اصل حافظ شیرازی کی غزل کا ہے یہاں بطور تضمین استعمال ہوا ہے۔ یعنی خوب رو چہرے کی مالک عورت کو غازہ، پاؤڈر، سرخی الغرض آرائش و زیبائش کی حاجت نہیں رہتی کیوں کہ حسن محتاجِ آرائش نہیں ہوتا۔ بقول شاعر:

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی ۔۔۔ کہ دیکھو خوش نما لگتا ہے کیسا چاند بن گہنے

یہاں اقبال نے یہ مصرعہ عصرِ حاضر کے مسلم نوجوان کو احساس دلانے کے لیے استعمال کیا ہے کہ ترے آباؤ اجداد جن کی حکومت آدھی دنیا تک پھیلی ہوئی تھی، بالکل سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، نہایت سادہ تھے مگر قیصر و کسریٰ اُن کے نام سے لرزہ براندام تھے۔ لیکن اے نوجوان آج تو جس قدر نکمے پن اور عیش و عشرت کا شکار ہو گیا ہے اسی قدر خوار ہوا ہے۔

**(5)** **گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے ۔۔۔ کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا**

**حل لغت:** گدائی: حالتِ فقر، فقیری ۔ غیور: غیرت مند ۔ منعم: امیر، دولت مند ۔ یارا: ہمت ۔ بخشش: خیرات، صدقات

**مفہوم:** تمہارے آباؤ اجداد عالمِ غربت میں بھی اس قدر غیرت مند تھے کہ امیر کو صدقہ خیرات دیتے وقت یہ خوف ہوتا تھا کہ کہیں غریب شخص ٹھکرا نہ دے۔

**تشریح:**

علامہ محمد اقبالؒ نے زیرِ تشریح شعر میں قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی ایک اور صفت یعنی غیرت بیان کی ہے۔

علامہ عنایت اللہ مشرقی کے بقول: "غیرت انسان کا زیور ہے"

اور بقولِ اقبال:

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں ۔۔۔ پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا

اسلام نے انسان کو عزتِ نفس عطا کی ہے۔ ایسے تمام امور جس سے انسان کی عزتِ نفس مجروح ہو اور توہین ہو اسلام میں ممنوع ہیں۔ اسی لیے بھیک مانگنا اسلام نے اچھا امر قرار نہیں دیا۔ حضورﷺ نے فرمایا:

ملعون من سال لوجہ اللہ (الحدیث) ترجمہ: جس نے اللہ کا واسطہ دے کر ہاتھ پھیلایا اُس پر لعنت ہو

ایک اور جگہ فرمایا:

"جس شخص نے ایک وقت کا کھانا گھر میں ہوتے ہوئے ہاتھ پھیلایا وہ ہم میں سے نہیں"۔ (الحدیث)

چناں چہ صحابہ کرامؓ اس معاملے میں بڑے محتاط تھے۔ ایک تو رسول اکرمﷺ کے احکامات سن کر اور دوسرا اُن کی غیرت بھی گوارا نہ کرتی تھی۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمان بے حد غیور تھے۔ حتیٰ کہ اگر کسی سوار کا کوڑا گر جاتا تو کسی راہگیر سے کہنے کی بجائے خود اتر کر اٹھاتا، کہ کہیں یہ امر سوال کے زمرے میں نہ آ جائے۔ امراو منعم حضرات جب کسی تنگ دست پر ترس کھا کر اُسے زکوۃ یا صدقہ خیرات وغیرہ دینے کا ارادہ کرتے تو انھیں ہمیشہ یہ خوف رہتا تھا کہ کہیں یہ غیرت مند ٹھکرا نہ دے، دراصل وہ لوگ صرف اللہ ہی سے سوال کرتے تھے۔ کسی بھی حاجت کی طلب کے لیے اُسی سے لو لگاتے تھے۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے محتاج تھے کہ:

دستِ طلب دراز ہے اللہ کے سامنے
دیتا ہے اپنے مانگنے والوں کو بے حساب

مواخات مدینہ ہی کا واقعہ دیکھ لیجیے۔ انصار اپنے مہاجر بھائیوں کو گھر لے گئے اور فرمایا یہ اتنی دولت تمھاری، یہ اتنا گھر تمھاری ملکیت۔ مہاجرین کی غیرت نے گوارا نہ کیا۔ کہنے لگے آپ کا مال و اموال آپ کو مبارک ہو ہمیں صرف بازار کی راہ دکھا دیجیے۔ مال سے تو یہ لوگ تہی دست تھے۔ لیکن دل میں رجائیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

اور فی الحقیقت غربت و فقر کا مقام شاہی سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ بقول اقبالؒ:

مقامِ فقر ہے کتنا بلند شاہی سے
روش کسی کی گدایانہ ہو تو کیا کہیے

شاعر آج کے نوجوان میں اُن کے اسلاف کے ذکر سے غیرت و خودداری کو بیدار کرنا چاہتا ہے۔ شاعر کے خیال میں یہ غیرت و خودداری کبھی مسلم قوم کی صفت تھی لیکن آج مکمل طور پر کایا پلٹ چکی ہے۔ انفرادی سطح ہو یا قومی سطح حالت یہ ہے کہ ہر گلی میں کئی فقیر صدائیں بلند کرتے ہوئے ملیں گے اور قومی سطح کی بات ہو تو ہمارے حکمران کشکول اٹھائے مغرب و صیہونیوں کے سامنے صدائے گدائی بلند کرتے نظر آتے ہیں۔ نتیجتاً آج ملک ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور امریکہ وغیرہ کا مقروض ہو گیا ہے اور قرض کی دلدل میں دھنستا ہی چلا جا رہا ہے۔ اقبال چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کی حمیت پھر سے بیدار ہو۔ اور جب یہ بیدار ہو جائے گی تو اُس میں پھر اجداد کے اوصافِ حمیدہ جنم لیں گے۔

(6) اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے، وہ نظارا

**حل لغت:** نقشہ: تصویر، خاکہ — تخیل: سوچ، خیال کی رسائی — فزوں تر: بہت اونچا، زیادہ بڑھ کر

**مفہوم:** اے نوجوان اگر میں چاہوں تو تیرے آباؤ اجداد کی عظمت کو تیری آنکھوں پر آشکار کر سکتا ہوں مگر یہ تیرے فہم و ادراک کی حدود سے بھی بالاتر ہے۔

**تشریح:**

زیرِ تشریح شعر سے پہلے اشعار میں علامہ محمد اقبالؒ نے نوجوان مسلم کو اس کی اسلاف کی عظمت کے چند پہلو بتائے ہیں۔ اب وہ عصرِ حاضر کے نوجوان سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اگر میں چاہوں تو شاہراہِ حیات پر تیرے آباؤ اجداد کے چھوڑے گئے رہبری کے نشانات کو الفاظ کا لبادہ اوڑھا کر تیرے سامنے عیاں کر سکتا ہوں۔ دراصل اقبال نے یہاں اپنی الہامی طاقت یعنی شاعری

کی تاثیر بھی بیان کی ہے اور قدیم مسلمانوں کی عظمت و شوکت کا بھی احاطہ کیا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ ان کی عظمت و سطوت کی لفظی تصویر میں تجھ پر عیاں کر سکتا ہوں۔ اگر میں چاہوں تو اُن کی ہیبت، جاہ و جلال کو شعری لباس پہنا کر تجھے ہلکی سی جھلک دکھا سکتا ہوں۔ میرے قلم میں یہ زور ہے کہ یہ قلم ان کے زورِ بازو و قوت کا احاطہ کر سکتا ہے۔

لیکن علامہ محمد اقبالؒ کہتے ہیں کہ یہ سعی لاحاصل ہوگی۔ اُن کی عظمت و ہیبت کی ایک لفظی تصویر دیکھ کر تمھاری آنکھیں چندھیا جائیں گی۔ اُن کے زورِ بازو کے متعلق سننے کی تمھارے کان تاب نہ لا سکیں گے۔ تمھاری بصارت اس قابل نہیں کہ اُن کی سطوت کی جھلک دیکھ سکیں۔ کیوں کہ وہ تو اس رتبے پر فائز تھے کہ جہاں تمھاری سوچ کی رسائی بھی نہیں ہے۔ اُن کی عظمت و عزت تمھارے حدود و خیال سے بھی کہیں پرے ہے۔ بقول شاعر:

اُن کی عظمت کا ذکر ہے بے شک
ترے حدِ خیال سے بھی پرے

اور عصرِ حاضر کا نوجوان اس کے زورِ بازو کو سمجھنے سے قاصر ہے بقول اقبالؒ:

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

دراصل اقبال نے زیرِ تشریح شعر میں ایک نفسیاتی حربہ استعمال کیا ہے۔ وہ نوجوان کی غیر ذمہ دارانہ سوچ پر اس کا احتساب کر رہے ہیں۔ وہ پستیوں میں گرے ہوئے نوجوان کو آباؤ اجداد کی حیات کے نقوش دکھا کر انھیں پھر سے اوجِ ثریا تک پہنچانے کے خواہاں ہیں۔ اس شعر میں انھوں نے تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھتے ہوئے نوجوان پر واشگاف الفاظ میں یہ واضح کیا ہے کہ اُس کا ذہن ناقص ہو چکا ہے۔ یہ غلام ذہن اُن آزاد اور حاکم مسلمانوں کے ادراک سے قاصر ہے۔

قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی لامحدود صفات اُس کے تنگ و تاریک گوشہ ذہن میں نہیں سما سکیں گی۔ یہ نوجوان جو غلامی کا لبادہ اوڑھنے پر مصر ہیں، جو فقط غلام ذہنیت کے مالک ہیں شاہی دستور کے فہم سے قاصر ہیں۔

حقیقت میں اقبال نوجوان کو ترغیب دے رہے ہیں کہ وہ اپنے ذہن میں انقلاب بپا کر دے، اپنی سوچوں میں انقلاب پیدا کرے۔ اپنے اعمال کا دھارا موڑے تاکہ وہ آباؤ اجداد کے مقام کو سمجھ سکے۔ وہ چاہتے ہیں کہ عصرِ حاضر کی مسلم نوجوان نسل اپنے ذہن کو وسعت دے تاکہ وہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں سے آشنائی حاصل کر سکے۔ مزید برآں یہ ذہنی وسعت دینی و دنیوی دونوں کامیابیوں میں اُس کا ساتھ دے گی۔

**(7) تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت، وہ سیارا**

(راولپنڈی 2006)

**حل لغت:**

نسبت: تعلق/واسطہ — گفتار: باتیں، گفتگو — کردار: عمل

ثابت: مقیم، ایک ہی جگہ ٹھہرا ہوا — سیارا: متحرک، حرکت کرنے والا

**مفہوم:**

اے نوجوان مسلم! تجھے اپنے آباؤ اجداد سے کوئی تعلق نہیں۔ تو باتیں بنانا جانتا ہے جب کہ وہ عمل کرتے تھے۔ تو ایک جگہ رکا ہوا ہے جب کہ وہ متحرک تھے۔

**تشریح:**

زیرِ تشریح شعر میں علامہ محمد اقبالؒ نے تمام تر واقعات کی کڑیاں ملانے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ عصرِ حاضر کے مسلم نوجوان کی قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں سے کوئی کڑی منسلک نہیں رہی۔ یہ نتیجہ بے محل یا کوئی شاعر کی بڑ نہیں۔ نوجوانوں کے حالات کے تناظر میں واقعی یہ فیصلہ بالکل صحیح ہے۔ دوسرے مصرعے میں اقبال نے اپنے مصرعے میں دیے گئے فیصلے کی وجوہات کو شعر میں بیان کیا ہے۔

اِن محرکات میں سے اقبال نے پہلا یہ بتایا ہے کہ تم باتیں بنانا خوب جانتے ہو۔ ہوائی قلعے بنانا تمھارا مشغلہ ہے۔ ریت کے گھروندے بنانا تم خوب جانتے ہو، خیالی پلاؤ پکانا تمھاری عادت ہے۔ شیخ چلی جیسے خواب دیکھنا تمھاری فطرت کا لازمی جزو بن چکا ہے۔ لیکن عمل ندارد۔ فقط ہاتھ پہ ہاتھ دھرے ہوئے ہو۔ بقولِ اقبال:

تھے تو آبا وہ تمھارے ہی مگر تم کیا ہو ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

تمھارے اسلاف جو کہتے تھے اس پر عمل بھی کرتے تھے۔ حجاج کی دھمکی کو راجہ داہر نے کوئی اہمیت نہ دی تھی۔ موسیٰ کے قول کو راڈرک نے دیوانے کی بڑ سمجھا تھا لیکن اُن لوگوں نے دیکھ لیا کہ یہ لوگ جو کہتے ہیں اُس پر عمل کرنا جانتے ہیں لیکن آج کا نوجوان گفتار کا غازی ہے کردار کا نہیں۔ بقول اقبالؒ:

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے گفتار کا یہ غازی تو بنا، کردار کا غازی بن نہ سکا

دوسری وجہ اقبالؒ نے مسلمانوں پر جمود کا طاری ہونا بیان کیا ہے۔ دراصل اقبالؒ کے نزدیک فلسفۂ حرکت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اُن کے نزدیک ہر چیز حرکت سے قائم و دائم ہے۔ ایک اور جگہ کہتے ہیں:

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

لیکن آج مسلمانوں پر جمود طاری ہو گیا ہے۔ وہ اس قدر نازک ہو چکے ہیں کہ چند میلوں کے سفر کے بعد اُن کے اعصاب جواب دے جاتے ہیں۔ سفر جیسی نعمت بے پایاں سے وہ محروم ہو چکے ہیں۔ عربی کا مشہور مقولہ ہے:

السفر وسیلة الظفر "سفر کامیابی کا ذریعہ ہے۔"

مسلمانوں پر یہ مقولہ صادق آتا ہے جو کہ آج ترکِ سفر سے کامیابی کی راہیں گنوا بیٹھے ہیں۔ جب کہ اُن کے آبا و اجداد متحرک تھے۔ بیک وقت ایک لشکر ایشیا میں قتیبہ بن مسلم باہلی کی سربراہی میں تسخیر ترکستان میں مگن تھا تو دوسرا لشکر موسیٰ بن نصیر کی قیادت میں افریقہ کی زمین کو اپنے پاؤں تلے روندر رہا تھا۔ تیسرا لشکر یورپی ممالک (ہسپانیہ و پرتگال) کو طارق بن زیاد کی سربراہی میں فتح کر رہا تھا۔ چوتھا لشکر محمد بن قاسم کی سرکردگی میں سندھ میں اسلام کا پرچم لہرا رہا تھا اور اس حرکت و تحریک کے دور میں انھیں عروج حاصل تھا۔ خود صحابہ کرامؓ اس قدر زمین میں پھیلے کہ آج بھی اُن کی قبور اقدس ہسپانیہ، مصر، مراکش، افریقہ، حبشہ، شام، حجاز سمرقند، ترکستان، موتہ، اُردن، شام، بحیرہ روم، قسطنطنیہ (استنبول)، خراسان، دمشق، حمص، الجزائر، افغانستان، ہندوستان عرب و عراق و کربلا میں ملتی ہیں۔ لیکن مسلمان حرکت کے اس سنہری اصول کو کھو بیٹھے ہیں اور زوال پذیر ہو گئے ہیں۔ ایک اور جگہ اقبال قوم کے نوجوانوں کے لیے یوں دعا گو ہیں کہ:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

(8) گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

(لاہور بورڈ 2008ء، راولپنڈی بورڈ 2006ء، سرگودھا بورڈ 13ء)

**حلِ لغت:**

گنوادی: کھودی، ضائع کردی اسلاف: سلف کی جمع معنی بزرگ، آبا و اجداد

میراث: ترکہ، ورثہ ثریا: آسماں پر چھوٹے چھوٹے ستاروں کا جھرمٹ جو آسمان پر بہت بلند دکھائی دیتا ہے۔

**مفہوم:**

اپنے بزرگوں کا چھوڑا ہوا دینی و دنیاوی ترکہ ہم نے گنوا دیا۔ جس کی وجہ سے آج ہم عروج سے ہٹ کر زوال کا شکار ہو گئے۔

## تشریح:

زیرِ تشریح شعر میں اقبالؒ فرماتے ہیں کہ جو قوم اپنے اسلاف کے عطا کردہ ضابطۂ حیات اور دستور کھو دیتی ہے اور اپنے بزرگوں کے اخلاق ترک کر دیتی ہے وہ زوال کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہی حال مسلم قوم کا ہوا ہے۔ اقبال جیسے حساس شاعر نے یہ بھانپ لیا تھا کہ عصرِ حاضر کے مسلمانوں کے زوال کی واحد وجہ آباؤ اجداد کے طریقوں کو ترک کرنا اور ان کے عطا کردہ ورثے کو گنوا دینا ہے۔ یہ ورثہ کئی قسم کا تھا۔ اولیں وہ جو حضور ﷺ نے چھوڑا۔ آپ ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا:

**''میں کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ دو چیزوں کو تمھارے درمیاں چھوڑے جا رہا ہوں انھیں مضبوطی سے تھامے رکھنا''**

جب تک مسلمانوں نے اس ورثے کو تھامے رکھا کامیاب رہے۔ لیکن آج قرآن وحدیث بے کواڑ کی الماریوں میں بھی مقفل ہے۔ لہٰذا یہ زوال مسلمانوں کا خود ساختہ ہے۔ بقول شاعر:

~ جو کچھ ہیں وہ سب اپنے ہی ہاتھوں کے ہیں کرتوت
**شکوہ ہے زمانے کا نہ قسمت کا گلہ ہے**

یہ ورثہ سائنسی بھی تھا۔ کبھی وہ دور تھا کہ مسلمانوں میں علم وفنون، سائنس وفلسفہ، سیاسیات واقتصادیات کو عروج حاصل تھا۔ اس زمرے میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ تہذیب وتمدن اُن سے تمام عالم نے سیکھا۔ نئے نئے علوم دریافت کیے۔ تجربات کیے اور انکشافات کو جنم دیا۔ سائنس کو وسعت دی۔ یہ ورثہ تعمیرات واختراعات کا بھی ہو سکتا ہے۔ جامعہ قرطبہ، قصر الحمراء، قصر زہرا ایا صوفیہ، جامعۃ الازہر، قصر خلد (عباسیوں کا محل) اور تاج محل جیسی تعمیری اختراعات چھوڑیں۔

لیکن عصرِ حاضر کے مسلمانوں نے مغرب کی اندھی تقلید شروع کر دی۔ پرتعیش اور سہل زندگی کی راہ ڈھونڈ لی۔ غفلت کا شکار ہو گئے اور اپنے بزرگوں کا چھوڑا ہوا ورثہ بھی گنوا دیا۔ قرآن وسنت کا دامن چھوڑ دیا۔ سائنسی علوم، علم وفلسفہ کی حفاظت نہ کر سکے اور آج یہ سب کچھ یورپ کے نام ہو گیا۔

~ لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل
**خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز**

جامعہ قرطبہ، الحمرا، تاج محل دشمنوں نے غصب کر لیے، قصر خلد اور قصر زہرا نذرِ آتش ہو گئے۔

آج مسلمانوں نے اپنے اسلاف کی چھوڑی ہوئی، وسیع وعریض سلطنتیں گنوا دیں، خوب صورت تعمیرات، شان دار اختراعات وایجادات کی حفاظت نہ کی۔ نتیجتاً زوال کی تاریک گھاٹیوں میں چلے گئے۔ اور خدا نے ان پر غیر اقوام کو مسلط کر دیا۔ یہ ازل سے ہی اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ زوال یافتہ قوم پر کوئی اور قوم ابھر کر حاکمیت کرنے لگتی ہے۔

~ تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
**ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات**

اپنے اسلاف کی روایات واقدار کو چھوڑ کر آج مسلمانوں نے اغیار کو نمونہ بنا لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہم ذلیل ہو رہے ہیں خوار ہو رہے ہیں اور نیست ونابود کیے جا رہے ہیں۔ اپنے اجداد کی عطا کردہ سنہری اقدار کو چھوڑ کر غیر مسلموں کے لباس، طرز رہن سہن، زبان، طرزِ معاشرت اور طرزِ تعلیم اپنا رہے ہیں۔ لیکن یاد رہے اغیار کا پیرو ہرگز بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جب تک مسلمان غیر مسلموں کی اندھا دھند تقلید میں مگن رہیں گے زوال کی دلدل میں دھنستے ہی چلے جائیں گے۔

**(9)** حکومت کا تو رونا کیا کہ وہ اک عارضی شے تھی
**نہیں دنیا کے آئینِ مسلّم سے کوئی چارا**

(لاہور بورڈ 2008ء، فیصل آباد بورڈ 2006ء، سرگودھا بورڈ 2013ء)

**حل لغت:** آئینِ مسلّم: تسلیم شدہ قانون، مانا ہوا اصول
چارا: بچاؤ، چھٹکارا، علاج

یہ دنیا کا تسلیم شدہ سچا قانون ہے کہ حکومت عارضی شے ہے۔

**مفہوم:**

**تشریح:** اقبال نے زیرِ تشریح شعر میں حکومت کو ایک عارضی شے قرار دیا ہے۔حکومت چار طرح کی ہو سکتی ہے۔(i) انفرادی حکومت (ii) خاندانی حکومت (iii) قومی حکومت (iv) عالمی حکومت

انفرادی حکومت کے عارضی پن کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی فرد کو آج عروج ہے تو کل اسے زوال بھی لازمی آئے گا۔ تاریخ ایسی صدہا مثالیں دے سکتی ہے۔ایک وقت تھا کہ کسریٰ خسرو پرویز ملعون کا طوطی بول رہا تھا۔تاہم چند ہی برس بعد اس کے بیٹے شیرویہ نے اس کے سینے میں خنجر گھونپ دیا۔نظام الملک الطوسی عالم اسلام کا شاید سب سے بڑا عظیم ترین وزیر اعظم تھا۔لیکن حشیشن کے خنجر کا شکار ہو گیا۔بہر صورت ایسی ہزار ہا مثالیں موجود ہیں۔

دوسری قسم خاندانی ہے۔ تاریخ میں بیشتر خاندانی حکومتوں کا عروج و زوال ملتا ہے۔ساسانی خاندان نے ایران پر ہزار برس حکومت کی لیکن زوال آیا تو کوئی شخص پناہ دینے کو تیار نہ تھا۔جعفر برمکی کی ماں جس کی خدمت کے لیے چار سو خادمائیں ہاتھ باندھے کھڑی ہوتی تھیں۔ بازارِ کوفہ میں بھیک مانگتی ہوئی پائی گئی۔ برصغیر کے مغل خاندان ہی کی مثال لے لیجیے۔کوئی دور تھا کہ برصغیر پر یہ خاندان حاکم تھا۔لیکن جب زوال آیا تو کوئی قبر کی جگہ دینے کو تیار نہ ہوا۔شیر خوار شہزادوں کو نیزے میں پرو دیا گیا۔ بہادر شاہ ظفر کے بیٹوں کے سر کاٹ کر اُسے پیش کیے گئے۔لہٰذا:

ہر کمالے را زوالے ترجمہ: عروج کو آخر زوال ہے

ترقی اور تنزل کو یاں ہے کچھ عرصہ مثالِ ماہ زیادہ نہیں مہینے سے

اب قومی و عالمی حکومت پر بھی نظر ڈال لیجیے تاکہ اقبال کا شعر مکمل طور پر سمجھ میں آسکے۔نمرود دنیا پر حاکم تھا۔مچھر کے ذریعے نیست و نابود ہوا۔ بخت نصر دنیا پر حاکم تھا لیکن جلد ہی یہ سلطنت بھی نیست و نابود ہو گئی۔سکندر اعظم نے دنیا کو فتح کیا لیکن اُس کے مرتے ہی اُس کی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔مسلمانوں نے ایران و روم کا غرور خاک میں ملا دیا۔800 برس بڑی شان و شوکت سے مسلمانوں نے حکومت کی۔

لیکن بارھویں صدی عیسوی میں منگولوں نے ہلاکو خان کی قیادت میں بغداد کا قلع قمع کیا۔لیکن پھر تاتاری مغل مسلمان ہوئے تو اسلام کی نشاط ثانیہ کا آغاز ہوا۔اور پھر سلطنتِ عثمانیہ کو عروج حاصل ہوا۔ برطانیہ نے دنیا کے بیشتر ممالک پر قبضہ جمالیا اور یونائیٹڈ کنگڈم تشکیل دیا۔ پھر 1947-1950 میں برطانیہ کو زوال آیا۔ اور پھر سوویت یونین کو عروج حاصل ہوا جس کا جنازہ 1992ء میں افغانی مجاہدین نے نکال دیا۔اور اب امریکی درندہ بھی نیم مردہ ہو چکا ہے۔

ان حالات کے تناظر میں اقبال کہتے ہیں کہ حکومت کا غم نہیں کیوں کہ یہ تو آنی جانی شے ہے کل پھر مسلمانوں کے پاس آسکتی ہے۔لہٰذا اس کے متعلق فکر کی ضرورت نہیں۔

ہے ساتھ زندگی کے دہر میں عروج و زوال گئی ہے شان امارت تو فکر کیا کرنا؟

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اس عمل کو یوں بیان فرمایا:

**تلک الایام نداولہا بین الناس (القرآن)**

ترجمہ: یہ دن (حکومت کے) ہم لوگوں کے درمیاں پھیرتے رہتے ہیں

**(10)** مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی     جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

(لاہور بورڈ 2008 فیصل آباد 2006ء)

**حل لغت:** آبا: باپ دادا، آباؤ اجداد سیپارا: تیس ٹکڑے مطلب ہے پارہ پارہ ہونا ٹکڑے ٹکڑے

**مفہوم:** جب اپنے بزرگوں کی کتابیں یورپ کے کتب خانوں میں دیکھتا ہوں تو میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔

**تشریح:** زیرِ تشریح شعر اس سے پہلے شعر سے مکمل طور پر متعلق (Relevant) ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ حکومت کے چلے جانے کا اتنا دکھ نہیں۔ جتنا مسلمانوں کے علمی اثاثے کے سقوط کا دکھ ہے جو آج اہلِ مغرب کی لائبریریوں کی زینت بنا ہوا ہے۔ فی الحقیقت اس شعر میں اقبال نے ایک اور عظیم المیے سے پردہ چاک کیا ہے۔ اقبال نے (1905 - 1908) تین سال کا دورانیہ پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے لندن میں گزرا اور اپنی تشنگیِ علم دور کرنے کے لیے یورپی لائبریریوں کا رخ کیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ نام نہاد عظیم یورپی لائبریریاں مسلمانوں کے علوم سے بھری پڑی ہیں۔

دراصل علم و ادب کی اس ڈاکہ زنی کے پیچھے ایک لمبی داستان کارفرما ہے۔ صلیبی جنگوں کے دوران عیسائیوں نے ایشیا سے علمی کتب حاصل کیں اور اپنے ساتھ یورپ لے گئے۔ ہلاکو خان کے حملہ بغداد نے مسلمانوں کے علمی اثاثے کو بہت نقصان پہنچایا۔ بیس لاکھ کُتب کی سیاہی سے دجلہ کا پانی سیاہ ہوتا رہا۔

ہمارے بزرگوں کی علمی کتابیں     کتب خانے یورپ کے معموران سے

اس داستان کا مرکزی پس منظر اندلس کا ہے۔ عیسائیوں نے جب قرطبہ پر قبضہ کیا تو قرطبہ یونی ورسٹی لوٹ لی۔ (۱۴۹۲ء) میں اندلس کے آخری مسلم صوبے غرناطہ کا سقوط ہوا تو عیسائی پادری زیمینیں نے مسلمانوں کا علمی اثاثہ ضبط کر لیا۔ چناں چہ دورِ حاضر کا ایک مؤرخ ہنری کامان اپنی تصنیف سپینش انکوی زیشن میں یہ اعتراف کرتا ہے کہ:

''غرناطہ میں زیمینیں نے ہزارہا قرآنی نسخے نذرِ آتش کیے۔ مذہب و دین پر مشتمل اس پادری کے حکم پر دس لاکھ پانچ ہزار کتابیں نذرِ آتش کی گئیں، صرف علم طب، کیمیا، فلسفہ، جراحت و طبعیات پر مشتمل تین ہزار کتابیں ایسی تھیں جسے اس تنگ نظر راہب نے عیسائیوں کے لیے سودمند تصور کرتے ہوئے القلعہ یونی ورسٹی ایک عیسائی یونی ورسٹی کے سپرد کی تھیں۔'' الغرض اس دور کے مسلماں ہر شعبے میں عروج کے حامل تھے۔ سائنس کی دنیا میں قرطبہ کا وجود مانندِ فانوس تھا۔ بغداد و قرطبہ کی اسناد تمام عالم پر حاوی تھیں۔ بقولِ شاعر:

طب اور کیمیا، ہندسہ اور ہیئت     سیاست، تجارت، عمارت، فلاحت
لگاؤ گے کھوج اُن کا جا کر جہاں تم     نشان اُن کے قدموں کے پاؤ گے واں تم

لیکن آج یہ تمام اثاثہ اہلِ مغرب نے لوٹ لیا۔ ذرا مزید آگے چلیے۔ سلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد انگلستان نے اُس کے نجی و سرکاری کُتب خانے کو قبضے میں لے لیا، شاہانِ اودھ اور نواب ضیاء الدین نیئر کا کتب خانہ بھی لوٹ کر برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری میں پہنچا دیا گیا۔

آج یہ تمام تصانیف میڈرڈ (سپین کا دارالحکومت)، لندن، پیرس، اٹلی اور برلن کے عجائب خانوں کی زینت بن چکی ہیں۔ بہر صورت کسی بھی قوم کا علمی اثاثہ ترقی میں سب سے بڑا معاون ہوتا ہے۔ لیکن اقبال اس بات پر نالاں ہیں کہ مسلماں کُتب و تصانیف کی بھی حفاظت نہ کر سکے جن سے استفادہ کر کے آج یورپ ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔

(11) غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کن — کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

(لاہور 2008ء، فیصل آباد 2006ء)

**حلِ لغت:** روزِ سیاہ: تاریک دن، بدقسمتی، بدبختی — پیرِ کنعاں: کنعان کا بوڑھا مراد ہے۔ حضرت یعقوبؑ
را تماشا کن: نظارہ کر، دیکھو، تماشا کرو — دیدہ اش: اس کی آنکھوں کی
روشن کند: روشن کیا — چشمِ زلیخا را: زلیخا کی آنکھ

**مفہوم:** غنی ذرا حضرت یعقوبؑ کی بدقسمتی تو ملاحظہ ہو کہ اُن کی آنکھوں کا نور (حضرت یوسفؑ) زلیخا کی آنکھوں کا تارا بنے ہوئے ہیں۔

**تشریح:** علامہ اقبال نے یہ شعر یہاں بطور تضمین استعمال کیا ہے۔ یہ شعر اصل میں ملا محمد طاہر غنی کاشمیری کا ہے۔ اس شعر میں حضرت یوسفؑ کی تلمیح استعمال کی گئی ہے۔ حضرت یعقوبؑ کو حضرت یوسفؑ سے بوجہ تقویٰ، راست بازی و حسن باقی بیٹوں کی نسبت زیادہ پیار تھا۔ چناں چہ حضرت یوسفؑ کے دس سوتیلے بھائیوں نے باہم فیصلہ کر کے آپؑ کو ایک کنویں میں پھینک دیا۔ جہاں ذوالجلال نے انھیں محفوظ رکھا۔ ایک قافلے کا گزر ہوا تو یہ لوگ آپؑ کو اُٹھا کر مصر لے گئے جہاں آپؑ کو فروخت کر دیا۔ عزیزِ مصر کی اہلیہ زلیخا نے آپؑ کو ورغلانے کی کوشش کی۔ لیکن آپؑ نے اُس کی دعوت کو ٹھکرا دیا۔ جس کی وجہ سے دس سال بے گناہ قید بھگتی۔ پھر آپؑ کو مصر کی حاکمیت حاصل ہوئی تو عزیزِ مصر کے انتقال کے بعد زلیخا سے عقد کر لیا۔

لیکن اس شعر میں غنی نے حضرت یوسفؑ کے متعلق صحیح رائے قائم نہیں کی۔ حضرت یوسفؑ کو زلیخا سے کوئی نسبت نہیں تھی اور نبی انبیا کرام اس طرح کے افعال کے مرتکب ہو سکتے ہیں کیوں کہ انبیا تو معصوم ہوتے ہیں۔

بہرصورت اس شعر میں پیرِ کنعاں سے مراد عصرِ حاضر کے مسلمان ہیں جن کا ادبی اثاثہ تلف ہو چکا ہے۔ نورِ دیدہ سے مراد مسلمانوں کے بیش بہا علمی اثاثے ہیں۔ زلیخا کا مطلب یورپ ہے۔ اقبال کہنا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کی بدقسمتی ملاحظہ ہو کہ اُن کے علمی و ادبی اثاثے یورپی اقوام نے لوٹ لیے اور یورپ کو بامِ عروج تک پہنچا رہے ہیں۔ اس سے کہیں بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف اس سے استفادہ کر رہے ہیں بلکہ یہ اثاثہ انھوں نے اپنے نام کر لیا۔ جراحت کے موجد ابوالقاسم زہراوی سے کوئی واقف نہیں۔ ہر کوئی اسے مغربی دنیا کا مرہونِ منت سمجھتا ہے۔ ڈیم سسٹم جو آج مغرب کا مرہونِ منت سمجھا جاتا ہے۔ ابن الہیثم کا ایجاد کردہ ہے۔ بوعلی سینا کی "القانون فی الطب" کی کئی شقیں مغرب والوں کے نام ہو چکی ہیں۔ آج یہ پروپیگنڈا عام ہے کہ پہلا ہوائی جہاز رائٹ برادران آف امریکا نے بنایا۔ حالاں کہ پہلا اُڑن آلہ عباس نامی عباسی عہد کے ایک شخص نے بنایا تھا۔ ریاضی میں جیومیٹری رازی نے متعارف کرائی۔

الغرض اس طرح کی ایک لمبی فہرست بن سکتی ہے۔ برصغیر ہی کی مثال لے لیجیے۔ پہلے پہل انگریز سیاحت کے لیے آئے، پھر تجارت کے لیے آئے، پھر طوائف الملوکی پیدا کر کے برصغیر پر قابض ہو گئے اور یہاں کے علمی ذخائر لوٹ کر لے گئے۔ برصغیر پر یہ شعر صادق آتا ہے۔

؎ شاخِ ہر نخل ہے حیران و تہی دست کھڑی — باغ کو لوٹ گئے سیر کو آنے والے

یا پھر:

؎ جو کچھ ہیں وہ سب اپنے ہی ہاتھوں کے ہیں کرتوت — شکوہ ہے زمانے کا نہ قسمت کا گلہ ہے